اُردو مثنوی کا ارتقا

عبدالقادر سروری

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

Scanned with CamScanner

۸

دورِ متوسط کی ابتدائی مثنویاں

قدیم اردو شاعری کا عہد گویا بیجاپور اور گولکنڈہ کے بچے کھچے شاعروں اور ان کے تابعین پر ختم ہو جاتا ہے۔ قدیم طرز کا سب سے نمایاں مسلک مثنوی نگاری تھا۔ جس کا ذوق ولی اورنگ آبادی کے زمانے کے بعد سے کم ہوتا گیا۔ متوسط عہد کی شاعری میں غزل اور تغزل غنائی اور عاشقانہ طرز کی شاعری کو تمام و کمال مقبولیت حاصل رہی۔ اور عصرِ حاضر تک اردو شعراء کا کم و بیش یہی مسلک رہا۔ متوسط عہد میں محض مثنوی لکھنے والے شاعر شاید ایک دو سے زیادہ نہیں دستیاب ہوسکیں گے اور اس کی ذمہ دار بڑی حد تک خود ولی اورنگ آبادی کی شاعری تھی، جن کے یہاں کلاسیکی انداز کی کوئی مثنوی نہیں ملتی۔

ولی نے اس میں شک نہیں کہ قدیم شاعری کے ماحول میں نشو و نما پائی تھی لیکن ان پر گوناگوں اثرات کام کر رہے تھے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح

ان کی شاعرانہ قابلیت اور طبیعت کی اپج اپنے زمانے سے مختلف تھی۔ وطن میں شعر و ادب کی کس مپرسی اور فطرت کے ذوق تماشا نے، انھیں نوعمری ہی میں، وطن کو اور وطن کے ساتھ اس کی شاعری کے ماحول کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا۔ گجرات اور احمد آباد کے عالموں اور ادیبوں کے درمیان رہنے بسنے سے انھوں نے فارسی زبان، فارسی کے اساتذۂ سخن کا انداز اور خاص طور پر حافظ و نیراز کو اپنے نمونے کے طور پر پیش نظر رکھا اور ان کی فکر شعری نے یہی رخ اختیار کر لیا۔

ولی جب دہلی پہنچے تو یہاں مغلیہ سلطنت اور اس کے ساتھ فارسی کا ستارہ غروب ہو رہا تھا۔ یہاں کے فارسی گو شعرا نے جب ان کا کلام سنا تو انھیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ شاعری ان کے دل کے قریب ہے "کیوں کہ اردو ان کی زبان تھی، گو مرکز گریزی کی خصوصیت کی وجہ سے اس کا رنگ روپ کچھ بدل گیا تھا۔ اس زبان کی طرف ان کا اس وقت بھی مائل نہ ہونا خلاف فطرت ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر دہلی میں اردو شاعری کا ذوق روز افزوں ہونے لگا۔

ولی کی شاعرانہ فکر کا حاصل ان کی غزل ہے۔ مثنویاں انھوں نے بہت کم لکھیں۔ ان کے کلیات میں صرف دو مثنویاں ملتی ہیں، جو مختصر ہیں۔ ان میں سے ایک روحانی کیفیت کا مرقع ہے، دوسری شہر سورت کی تعریف میں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی مثنویاں دہلی کے ابتدائی دور کے سخن سنجوں کے لئے نمونہ بن گئیں ۔ ولی کی مثنویاں بیانیہ نہیں بلکہ مرقعوں کی مثنویاں ہیں جن میں مخصوص مرقعوں کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ ان کی مثنوی "در تعریف شہر سورت" بہت مقبول مثنوی ہے ۔ اس مثنوی سے ایک اقتباس درج ذیل ہے :

عجب شہراں میں ہے پر نور یک شہر
بلا شک وہ ہے جگ میں مقصد دہر

اہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت

جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور
اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور

شہر جوں منتخب دیوان ہے سب
ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب

سرج سُن آب اس کی جگ میں کانپا
سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا

کنارے اس کے اک دریائے تپتی
کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے تپتی

شہر سوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ
دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ

کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر
ہوا دیتی ہے اس کی یاد شمشیر

عجب قلعہ ہے واں اک با قرینہ
انگوٹھی میں دنیا کی جیوں نگینہ

نزک قلعے کے بارہ گھاٹ ہے واں
کہ دائم گُل رخاں کی ہاٹ ہے واں

اے بلبل پاک بینی سوں نظر کر
کثافت کی نظر سوں بس عذر کر

کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گُل
ہر اک گُل کے تزک واں پر ہے سنبل

جو کُئی دیکھا ہے ان کا باغ رخسار
ہوا اک دید میں وہ محو دیدار

اہے سورت حقیقت کی نشانی — کہ ہے معمور وہاں اہلِ معانی
اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز — نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زرخیز
کہ اس بھیتر کتے ایسے ہیں تجار — کہ قاروں کو نہیں ان کے نزک بار
اتی آتش پرستاں کی ہے بستی — سکھے نمرود واں آتش پرستی
فرنگی اس میں آتے ہیں کلہ پوش — عدو وھاں جنکی گنتی میں ہے بے ہوش
وہاں ساکن اتے ہیں اہل مذہب — کہ گنتی میں نہ آویں اہل مشرب
اگرچہ سب ہیں وہ ابنائے آدم — ولے بینش میں رنگارنگ عالم
بھری ہے سیرت وصورت سوں سورت — ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت
سبھا اندر کی ہے ہر اک قدم میں — چھپیا اندر سبھا کوں لے عدم میں
نہ گئی وقت سوں کھینچے شوخ آنچل — وہ مکھ کے باغ کن دیوار آنچل
نظر بھر کر دکھوں ہر گلبدن کوں — کہ ہے پردے سوں بے پروا اُنن کوں
پڑا شیرین بچن سن ان کے بس جو — پھنسا اس شہر میں جا کر مگس ہو
شہر بھیتر جو آوے نہان کا دن — ہندو کی قوم کے اشنان کا دن
ہر اک جانب دکھوں ہیں فوج در فوج — تجلّی کے سمندر کی اُٹھی موج
نین کی بیٹھ کشتی پر تو اے پاک — یہ طے کر سہج میں موجِ خطرناک
عبث باتاں ہے بس کر اے ولی تو — نہ کر مقصد سوں اپنے کاہلی تو

متوسط دور کی ابتدائی مثنویاں اسی طرز کی ہیں۔ مثلاً حاتم کی مثنویاں

"حقہ" اور "قہوے" کی تعریف میں۔ آبرو کی مثنوی "آرائش معشوق" اور خاص طور پر فائز کی مثنویاں "بیان میلہ بہتہ" اور خاص طور پر "تعریف نہان نگنبود" جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، ولی کے انداز کی مثنوی ہے۔ شہر سورت میں تاپتی ندی پر جس طرح ہر صبح اشنان کرنے والوں کا میلہ لگا رہتا ہے، یہاں بھی لوگ اشنان کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اس مثنوی کے چند شعر درج ذیل ہیں:

ندی پر نمایاں ہیں سیمیں بدن — جیوں روپے کی تھالی میں ڈھلتے بدن
کھڑے گھاٹ پر ہیں سبھی نیم بر — خجل ان کے مکھ سے سورج اور چندر
کرے دل کو پانی ہر اک ہندنی — نظر پڑتی پانی اوپر چندنی
مرے دل کو آتا ہے اس سے حذر — کہ ان کو نہ لاگے سورج کی نظر
نظارہ اناں کا کروں صبح و شام — مجھے رات دن ہے نکویاں سے کام

اس دور میں میر نے مثنوی کو بہت ترقی دی اور کئی مثنویاں لکھیں۔ مرقعوں کو انھوں نے بسیط تر بنانے اور جزئیات پر زیادہ حاوی کرنے کی کوشش کی۔ قصوں کو بھی انھوں نے پھر مثنوی کے ساتھ جوڑا۔ لیکن اس خصوصیت میں میر کی کوششیں بہت ابتدائی نمونے کی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے قصوں میں سادگی بیان زیادہ نمایاں اور فوق الفطرت عناصر کم ہیں۔ پھر بھی وہ نصب العینیت اور رومانیت سے بالکل خالی نہیں ہیں، جو قدیم قصوں کا لازمہ ہے۔ ان مختصر قصوں میں، مناظر اور مکالموں کی بھی کمی ہے۔

Scanned with CamScanner

لیکن یہ اضافی نقطۂ نظر ہے۔ بنفسہٖ میرؔ کی مثنویاں اردو میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان کے معاصر سوداؔ کی مثنویوں میں یہ لطف کبھی نہیں ہے۔ سودا کے قصوں میں قصہ پن کم اور مرقعوں (ڈسکرپشن) میں مشاہدے کے عمق کا فقدان ہے۔ ان کی صرف ایک مثنوی "زرگر پسر و شیشہ گر" پڑھنے کے قابل ہے۔

دہلی کی تباہی سے پہلے، شمالی ہند میں، طویل، بسیط اور مکمل ادبی مثنویاں نہیں لکھی گئیں۔ صرف ایک مثنوی "خواب و خیال" ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس عہد میں لکھی ہوئی تمام مثنویوں سے زیادہ طویل ہے اور مرقع نگاری میں، اس کے بعض پارے بے مثل ہیں۔ اس کے اسلوب کی سادگی اور لطف زبان بھی قابلِ تعریف ہے۔ لیکن اس کے تناسب اور تکمیل میں نمایاں اسقام ہیں اور جیسا کہ پچھلے اوراق میں اشارہ کیا گیا ہے، وہ قصہ سے شروع ہوتی ہے اور تصوف پر ختم ہو جاتی ہے۔ سراپا کا مرقع اس کی جان ہے۔ بظاہر اس میں ایک قصہ بیان کیا گیا ہے لیکن سراپا کے مقابلے میں قصہ کی اہمیت کم اور اختتام مبہم رہ جاتا ہے۔

دکن میں دلی کے بعد مختصر مرقعوں کی طرز کی مثنویاں بھی رائج ہو گئیں۔ لیکن قدیم طرز کی طویل قصہ دار مثنویاں بھی اسی شرح و بسط کے ساتھ لکھی جاتی رہیں۔ پہلی قسم کی مثنویوں پر دلی کے جانشین سراج اورنگ آبادی کے سوا

بہت کم شاعروں نے طبع آزمائی کی۔ اور دوسری قسم کی مثنوی کو تو سراج نے گویا دکن میں معراج کمال پر پہنچا دیا۔

مختصر مثنویاں، سراج نے کل سات لکھیں، لیکن ان کا رنگ خاص ہے۔ یہ سب کی سب متصوفانہ خیالات کی حامل ہیں اور عاشقانہ مثنویوں میں بھی تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ان مثنویوں کا انداز بیان اثر خیز ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مختصر مثنویوں کا لطف میر کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔

سراج کی طویل مثنوی "بوستانِ خیال" دکن کی بہترین اور اردو کی بلند پایہ مثنویوں میں سے ہے۔ اس کی عظمت کی بنیاد طوالت نہیں بلکہ شاعرانہ کمالات ہیں۔ سراج کا اسلوب، جدید روزمرہ سے قریب تر اور میر اور سودا کے اسلوب سے بہت کم مختلف ہے۔ اس مثنوی کا لطف مناظر کے مصورانہ بیانات مرقعوں اور جذبات انسانی کی صحیح صورت گری میں ہے۔ اگر روزمرہ کے جزوی اختلاف کو وجہ امتیاز بنایا جا سکتا ہے تو "بوستان خیال" کا درجہ "سحر البیان" کے بعد ہے۔ ورنہ اس کے بعض پارے "سحر البیان" پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ مثال کے لئے ذیل کا اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے:

ہر یک سمت پانی کی نہروں کی سیر — وہ نہروں میں پانی کی لہروں کی سیر
میں جب دیکھتا تھا وہ نہروں میں لہر — زیادہ دو نہروں سے چڑھا تھا زہر
رواں آب کے ہر طرف آبشار — جدھر دیکھیے ہو رہی تھی بہار

طرب بخش تھا ناچنا مور کا
تماشا تھا ہر مور کے شور کا

ہر یک سرو پر عشق پیچے کی بیل
خوشی کے گلے کی تھی گویا حمیل

جھکی ڈالیاں بید مجنوں کی تھیں
خمِ زلف لیلیٰ کے افسوں کی تھیں

ہر اک حوض پانی سے لبریز تھا
ہر اک قطرہ باغ گل خیز تھا

سمن ارغواں ، نرگس عنبری
گل لالہ و سیوتی ، جعفری

تھے منڈوے ہر اک قسم انگور کے
سو خوشے تھے وہ طرۂ حور کے

درخت آنب کے سبز اور سایہ دار
نہالانِ نوخیز رنگیں بہار

ادھر بلبلوں کی غزل خوانیاں
ادھر پھول کی شبنم افشانیاں

ادھر سرو رعنا کے سبزے کی دھوم
ادھر نغمۂ قمریوں کا ہجوم

ہزارا اناراں کے تختوں کی سیر
نئی کونپلوں کے درختوں کی سیر

پٹ جھوم آیا تھا ابرِ بہار
برستی تھی باریک چھم چھم پھنوار

عجب وقت تھا اور عجب رنگ تھا
ولیکن مرا دل پٹ تنگ تھا

ہر یک قسم کا میوۂ خوش مذاق
جسے دیکھ کھانے کا ہوے اشتیاق

مجھے دیکھنا تلخ تھا اس طرف
کہ تھا دل مرا تیرِ غم کا ہدف

"بوستان خیال" کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ قدیم مثنویوں کے تفصیلی بیانات اور جزئیات کے مرقعوں اور جدید مثنوی کی حقیقت اور تکمیل کا بہترین مجموعہ ہے۔

Scanned with CamScanner

گذشتہ دور کے وفا شعار پیرو اس زمانہ میں نوازش علی خاں شیدا تھے۔ جنھوں نے دو طویل مثنویاں لکھیں "روضۃ الاطہار" اور "اعجاز احمدی" یہ دونوں طویل مثنویاں قدیم مذہبی اثر کی یادگار ہیں۔

ایک اور قابلِ ذکر مثنوی "قصہ لعل و گوہر" ہے جو عارف الدین خاں عاجز کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی مثنوی ہے۔ جس کے واقعات، افراد اور بیانات سب فرضی اور نصب العینی ہیں لیکن اس کا اسلوب لطف سے خالی نہیں ہے۔ اسی لئے معاصرین اس سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ شاہ غلام قادر سامی جو اسی زمانے میں برار سے آکر اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے تھے، اس مثنوی سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کے جواب میں خود ایک طویل مثنوی "قصہ سرو شمشاد" لکھی تھی۔ شاہ سامی کے معاصر اور رفیق لالہ لچھمی نارائن شفیق نے "چمنستان شعراء" میں اس کی بڑی تعریف لکھی ہے اور اس کے طویل اقتباسات نقل کئے ہیں۔ جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ یہ مثنوی اب غالباً نایاب ہے۔ سامی کی ایک اور مثنوی "طالب و موہنی" کا ذکر بھی شفیق نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے جو اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتی۔ "طالب و موہنی" کے عنوان کی جو مثنوی انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس کے مصنف میر سید محمد والہ ہیں۔ یہ ۱۱۷۱ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔ والہ حیدر آباد کے رہنے والے تھے،

لیکن نورالدین خاں والاجاہ سے توسل کے سبب وہ ارکاٹ چلے گئے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ولی کے اثر سے، اس وقت دکن میں غزل کا کافی رواج ہو چکا تھا، تاہم مثنویاں بھی برابر اور مسلسل لکھی جاتی رہیں۔ اکثر شاعر جن کا ذکر اس دور کے تذکروں میں ملتا ہے، نہ صرف غزل بلکہ مثنویاں اور خاص کر طویل مثنویاں بھی لکھتے تھے۔ لیکن ابھی ان میں سے اکثر مثنویاں گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔

عبدالولی عزلت، جو ولی کے "شہر پرنور" کے رہنے والے تھے، اور دہلی میں بھی ان کا قیام رہا، جہاں میر تقی میر سے ان کی ملاقاتیں رہیں اور قدیم شعراء کے بارے میں میر نے اپنے تذکرہ کے لئے ان کی بیاض سے مواد حاصل کیا تھا، صاحبِ دیوان تھے۔ اس کے علاوہ تین مثنویاں بھی انھوں نے لکھی تھیں۔ ایک "بارہ ماسہ" جو ان کے دیوان میں شامل ہے، دوسری "ساقی نامہ" اور تیسری مثنوی جو "راگ مالا" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں موسیقی کے چھ راگوں اور راگنیوں کی تشریح بڑی خوبی سے کی ہے۔ یہ بارہ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ ہر راگنی اور پتر کی تفصیل کی جو تصویر وہ کھینچتے ہیں بڑی پرلطف ہے۔ ذیل میں پتر آنند کی تصویر ملاحظہ ہو:

عجائب ایک تھا رنگیں نشیمن — کہ اوس کے صحن میں پھولا تھا گلشن
بچھا تھا اس میں فرش زعفرانی — کہ اوس کا حاشیہ تھا ارغوانی

بجاتا بانسری وہاں اک جواں تھا — کہ جاہ حسن سے وہ کامراں تھا
کنار اس کے تھی بیٹھی ایک پیاری — کہ اس کی نے نوازی کی تھی ماری
لئے تھی بیڑہ پان تا نیا دے — وہ دل تھا چاہے دلبر کو دکھلا دے
پری رو دو تھیں آگے نغمہ پرداز — ہر اک کے ہاتھ میں باجے تھا اک ساز
بجا ہیں ایک کرتی نغمہ سازی — کرے تھی دوسری مندل نوازی
پرندہ سن کے لاگا سیس دھننے — اتر کر اندر آیا راگ سننے
جوان کے دل میں سودا کی لگی ہول — سرود غیر و اپنا بھی گیا بھول
سماے سے مگن ہو مرد دلبند — بنا کر دل سے گایا بیتر آنند

اس دور کو ختم کرنے سے پہلے دکن کی ایک نہایت دلچسپ مثنوی کا ذکر ضروری ہے۔ یہ لالہ لچھمی نارائن شفیق کی تصنیف "تصویر جاناں" ہے۔ شفیق اورنگ آباد کے متوطن اور مولانا میر غلام علی آزاد کے شاگرد رشید تھے۔ اورنگ آباد میں قدیم اور جدید محاورہ کا سنگم ہوا تھا۔ اس طرح ان کی زبان پر شمالی ہند کے محاورے کا کافی اثر تھا۔ اس کے علاوہ یہ مثنوی ایک طبع زاد اور نہایت اچھی قصے پر مشتمل ہے اور اس قابل ہے کہ اردو کی اعلیٰ پایہ مثنویوں میں اس کو جگہ دی جائے۔ اس میں کمی صرف مناظر اور مرقعوں کی ہے جو "بوستان خیال" اور "سحر البیان" کی جان ہیں۔ یہ مثنوی اب چھپ چکی ہے۔

گولکنڈہ کے شعراء کے متعلق، مشرقی دکن، مدراس وغیرہ کی طرف منتشر ہوجانے کا ذکر اوپر گذر چکا ہے جہاں ویلور، سدھوٹ، کرنول وغیرہ میں چند امراء جن میں سے بعض قدیم سلطنت گولکنڈہ کے متوسل رہ چکے تھے، ان کی قدر دانی کرنے کے لئے موجود تھے۔ ان شعراء کے اثر سے کئی اچھے اچھے شاعر اس نواح میں بھی پیدا ہوئے، جن میں ہمارے موجودہ مقصد کے تحت، مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ بڑے پرگو شاعر اور انشاپرداز تھے۔ ایک دیوان کے علاوہ، جس کا دیباچہ انھوں نے اردو نثر میں لکھا ہے کئی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں جو مذہبی اور متصوفانہ موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہ مثنویاں حسب ذیل ہیں: "ریاض الجناں"، "ہشت بہشت"، "محبوب القلوب"، "مثنوی روپ سنگار"، "گلزار عشق"، "قصہ رضوان شاہ" وغیرہ۔ آگاہ مثنوی کو قدیم اساتذہ کے اصول پر لکھتے تھے۔

دہلی میں جب اردو شاعری کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے تھوڑے عرصے کے اندر اس کا اثر دور دور تک پھیل گیا۔ چنانچہ پنجاب میں بھی کئی اچھے اچھے شاعر پیدا ہونے لگے جنھوں نے دبستان دہلی کے اتباع میں قدیم پنجابی شاعری کا نہج بدلنا شروع کیا۔ غزل، ترجیع بند، مثنوی، غرض اکثر مقبول اصناف میں یہاں نظمیں لکھی جانے لگیں۔ مثنوی کی حد تک صرف دو شاعروں کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ ان میں سے ایک حضرت

غلام قادر شاہ ہیں جن کی وفات ۱۱۷۶ھ میں ہوئی۔ یہ بڑے صاحب باطن بزرگ تھے۔ ان کے حالات اور ان کی مثنوی "رمز العاشقین" کا ذکر پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں مفصل لکھا ہے۔ مثنوی کے متعلق وہ رقمطراز ہیں "اس مثنوی کا وزن عروضی خالص ہندی ہے۔ پنجابی لہجے کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ یہ درحقیقت دہلی کے جدید اسکول سے بہت کم متاثر ہے اور قدیم مذہبی اردو شاعری کی آخری یادگاروں میں سے ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو "پنجاب میں اردو" سے ماخوذ ہے۔

سات مراتب بوجھ پیارے — ہر ہر کے ہیں روپ نیارے
ست گرسوں توں کر تحقیق — نا ہو ملحد نا زندیق
فرق ارجمع موں فرق پچھان — پھر دونوں کوں ایک ہی جان
بوجھ لیوَ تنزیہ کو خوب — نا ہو ملحد نا مجوب
بھی تشبیہ کوں جانوں نیک — پھر دونوں کوں جانوں ایک
ظاہر موں ہے وحدت کثرت — باطن موں ہے کثرت وحدت
قدم وجوب کے سب اسماء — جانوں فاعل فی الاشیاء
ازلی ابدی ہیں درکار — نا نہ معطل نا بے کار
اس مشہد موں ہے مسجود — فہو القاصد و المقصود
یوں ہے سب اسماء کیانی — حادث جانوں اور نقصانی

اس مظہر میں رکھے ساجد — فہو الطالب وہو العابد
بندے کا ہے طاعت کام — "واعبد ربک" سنوں کلام
کرو عبادت دن اور رات — شرک اور رشک سوں ہوئے نجات
کرو عبادت شرع آئین — حاصل ہوئے نورِ یقیں
جس کوں ناہیں شرع گواہ — جانوں اس کوں تم گم راہ
حق نے کہیا نورِ مبیں — شرع کوں بیچ کتابِ متیں
جس کوں حاصل ناں یہ نور — طبع ہوا کا ہے مغرور
ناں ہوا اس کو قرب وصال — شرع بنا ہے قرب محال

دوسرے بزرگ حضرت مراد شاہ ہیں جو لاہور کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کا سفر بھی کیا تھا اس لئے ان کے اسلوب پر وہاں کے اساتذہ کا اثر کافی ہے۔ یہ صاحب دیوان ہیں۔ اپنے ایک شاگرد کے کہنے سے انھوں نے قصۂ چہار درویش کو نظم کا جامہ پہنانا شروع کیا تھا لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ ۱۲۱۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

دہلی کے اساتذہ مثلاً میر اور سودا کی طرز میں وہ مثنوی خوب لکھتے تھے اور جیسا کہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے "ان کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ہے۔ مثنوی میں وہ کسی سے پیچھے نہیں اور اہل ہندوستان کے دوش بدوش ہیں"۔

ذیل میں ان کی ایک دلچسپ مثنوی "مگس نامہ" کا کچھ حصہ "پنجاب میں اردو" سے اخذ کر کے نقل کیا جاتا ہے۔ اپنے وطن لاہور کی تعریف میں وہ لکھتے ہیں :

کیا بہار اس کی کروں تحریر — شہر تھا یا مرقع تصویر
گلعذاروں پہ حسن کی تھی بہار — گل تھے ہر ایک کے گلے کا ہار
کھینچتے تھے دکھا کے رخ، دل کو — خانہ خانہ میں تھے کمال ابرو
خوب رو تھے حیا سے سب موصوف — اور عاشق وفا میں تھے معروف
رشکِ آبادی جہاں تھا یہ — الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ
سو زمانے نے ایسی زشتی کی — خوبی اس قطعۂ بہشتی کی
لے کے دوزخ میں ڈال دی یکبار — وقنا ربنا عذاب النار
نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے — مکھیوں کی غرض دہائی ہے
زر تو شاہ زماں سدھارے — مکھیوں کو گئے اجارہ دے
اب ہیں پر مکھیوں سے سب لاچار — ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار
نہیں آرام ان سے رات اور دن — کھا گئیں کان سب کے کر بھن بھن
دن کو کیا کہئے بات کھانے کی — اٹھ گئی رسم ہی پکانے کی
آتش جوع نے جگر کو کباب — جس کے دل کوں کیا ہو سو بیتاب
خشک روٹی کہیں پکاتا ہے — کس مصیبت سے وہ بھی کھاتا ہے

اور قلیہ پلاؤ کھائے کون ہو سکے کس سے اور پکائے کون
پک گئی شب کہیں جو تھوڑی دال اس کے کھانے کا کیا لکھوں احوال
ماش کا دیکھ بیج میں چھلکا کھا کے وسواس وہ جو تھا دل کا
منھ سے لقمہ وہیں اُگل ڈالا دیکھیو دال میں ہے کچھ کالا
یا یہ کہتے تھے کیا ہوا، ہے ہے لائیو طشت مجھ کو آتی ہے

فقیر اللہ آزاد ایک اور بزرگ ہیں جن کی ایک مثنوی "درمکنون" ۱۲۰۴ھ کی تصنیف ہے۔ اس کی بحر ہندی ہے اور اس کو پڑھنے سے شاہ برہان الدین جانم کی مثنویوں کی یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔

رحمت شاہ جو اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں مثنوی "شیریں فرہاد" کے مصنف ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر نو دس شعر کے بعد ایک دوہا آجاتا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے زبان کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ بھاشا اور پنجابی آمیز ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کبھی پنجابی غالب ہے اور کبھی برج"[1]

---

[1] "پنجاب میں اردو" ص ۳۰۵